نقطہء نظر

منیر سامی

صدر اوباما، مسلمان، پاکستان

ممتاز صحافی 'انور اقبال' نے پاکستان کے معروف انگریزی اخبار ڈان کے لیئے، ۲۰۰۹، میں صدر اوباما کے ساتھ ایک انٹرویو کیا تھا۔ اس انٹرویو میں کچھ دلچسپ باتیں منظرِ عام پر آئیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اوباما، ۱۹۸۱ میں پاکستان گئے تھے جہاں انہوں نے کچھ دن اپنے دوست محمد چانڈو کے گھر قیام کیا تھا، اور اس دوران وہ کچھ دن کے لیئے حیدرآباد بھی گئے۔ اسی زمانے میں انہوں نے دال اور قیمہ بھی پکانا سیکھا، اور کرکٹ کھیلنے کی بھی کوشش کی، لیکن وہ اب بھی ٹھیک سے بلا استعمال نہیں کر سکتے۔ یہاں یہ حوالہ اس لیئے دلچسپ ہے کہ پاکستانی شہریوں اور امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کے لیئے امریکہ صدر کا انتخاب ایک اہم معاملہ بن گیا ہے۔

امریکی انتخابات پر صرف پاکستانی ہی نظر نہیں رکھتے، بلکہ ساری دنیا کی نظریں ان انتخابات پر اور امریکہ کی سیاست پر لگی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ دنیا کا سب سے طاقتور ملک سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی رائے عامہ اور دانشوروں کی امریکہ کے بارے میں متضاد آرا ہیں۔ کچھ اسے ایک ظالم سامراجی طاقت گردانتے ہیں، اور کچھ اسے ایک مثالی جمہوریت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ لیکن تمام اہلِ دانش اس بات پر متفق ہیں کہ امریکہ ایک مکمل سرمایہ دار ملک ہے، جہاں ہر فیصلہ سرمایہ داری کے اصولوں پر کیا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کی بنیاد پیداواری وسائل پر شخصی اجارہ داری، اور معاشی وسائل پر مکمل قبضہ پر قائم ہے۔ یہ وسائل پر اجارہ داری ہی کا معاملہ ہے جس کی بنا پر امریکہ اور اس کے اتحادی دنیا کے ہر اس خطہ پر اپنا مکمل اثر قائم کرنا چاہتے ہیں، جہاں صنعتوں کو مددگار وسائل پائے جاتے ہوں، ان میں تیل، قدرتی گیس، معدنیات، اور زرعی پیداوار کے ساتھ اب سستے انسانی وسائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ عالمی سطح پر ہر اس مدِّ مقابل کو زیر کرنا چاہتا ہے جو اس کے وسائل پر قبضہ کے معاملہ میں آڑے آتا ہو۔ اس میں روس، چین، بھارت اور ایسے تمام ممالک شامل ہیں، جو سرمایہ داری معاملات میں امریکہ کے لیئے خطرہ کا باعث ہوں۔

امریکی انتخابات کے وقت اس کے عالمی معاملات بھی اہم ہوتے ہیں لیکن امریکی شہری اپنی حکومتوں کا انتخاب کرتے وقت عام طور پر اپنے داخل معاملات کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں۔ ان معاملات میں شخصی اور کاروباری ٹیکس، تعلیم، روزگار، عورتوں کے حقوق، اقلیتوں کے حقوق، ماحولیات، تارکین وطن کے معاملات، قومی دفاع اور تحفظ، اور نسل پرستی اہم جانے جاتے ہیں۔

گزشتہ دو سو سال میں امریکہ کی سیاست دو سیاسی جماعتوں میں گردش کرتی رہتی ہے، یہ جماعتیں ری پبلیکن جماعت Republican، اور ڈیموکریٹک Democratic جماعت، ہیں۔ ان میں ری پبلیکن جماعت قدامت پرست جماعت ہے جو انفرادی شخصی اور کاروباری حقوق، قوی سرمایہ داریت، مذہبی قدامت پرستی، کاروبارِ مملکت میں حکومت کے کم سے کم دخل کی بنیاد پر سیات کرتی ہے۔ اس کے برخلاف ڈیموکریٹک جماعت طور پر آزاد خیال، انسانی حقوق کی حامی، فلاحی معاملات میں حکومت کی ذمہ داری، انسانی مساوات، اور نرم دل سرمایہ داری کی بنیاد پر حکومت کرنے کی حامی ہے۔

امریکہ کے آیئن کے مطابق امریکہ کی ریاست یا صدر نہ تو کسی مذہب کی طرف داری کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی مذہب کے پرچار کو روک سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ری پبلیکن جماعت کے رہنما اور سیاست دان ایسی پالیسیاں بنانے کی کوشش کرتے ہیں جن کے ذریعہ انسانی معاملات میں مذہب کا عمل دخل کسی طرح قائم رہ سکے۔ گو مذہب کی بنیاد پر قانون سازی کرنا امریکہ میں تقریباً ناممکن ہے۔

یہاں بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں امریکہ کے اکتیس صدور میں سے اٹھارہ کا تعلق ری پبلیکن جماعت سے تھا اور تیرہ کا تعلق ڈیموکریٹک جماعت سے تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کی سیاست عموماً قدامت پرستوں کے ہاتھوں میں رہی ہے۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ تقریباً دو سو تیس سال پہلے امریکہ کے قیام سے اب تک صرف ایک غیر سفید فام شخص امریکی صدر بن سکا ہے جو موجودہ صدر اوباما ہیں، اور اب تک کوئی خاتون امریکہ کی صدر نہیں بن پائی ہے۔ اس سے بھی امریکہ معاشرہ میں قدامت پرستانہ اثر و رسوخ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ امریکی معاشرہ دنیا کے کسی بھی معاشرہ کی طرح ارتقا پذیر ہے گو بعض معاملات میں اور خصوصاً ایسے معاملات میں جن میں آزاد خیال اور انسان دوست دلچسپی رکھتے ہیں یہ ارتقا کبھی کبھی تکلیف دہ حد تک سست رفتار دکھائی دیتا ہے۔

کینیڈا کی طرح امریکہ بھی ایسا ملک ہے جس کی بنا اور ارتقا تارکین وطن پر قائم ہیں۔ یہاں تارکین وطن مختلف لہروں میں آباد ہوتے رہے ہیں۔ پہلے یہ لہر یورپ کے سفید فام لوگوں پر مشتمل تھی، پھر رفتہ رفتہ اس میں چینی نژاد، جنوبی ایشیائی، اور لاطینی امریکہ کے ہسپانوی لوگ شامل ہوتے گئے۔ یہ لوگ عام انسانی تعصّبات کی بنیاد پر اکثر قبائلی اور قومی بنیاد پر بھی ووٹ ڈالتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ امریکہ کی سیاست پر آئرش نسل کے لوگ اور اطالوی لوگ اثر انداز ہوتے تھے یا کم از کم ان کے مجموعی ووٹ بعض علاقوں میں سیاست کا توازن فراہم کرتے تھے۔

حالیہ انتخابات میں دیکھا گیا کہ ہسپانی نژاد لاطینی امریکیوں کی ایک بڑی تعداد نے صدر اوباما کے حق میں ووٹ ڈالا اور جن اہم ریاستوں میں ان کی بڑی تعداد آباد ہے وہاں سے ڈیموکریٹک پارٹی کو زیادہ کامیابی ہوئی۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ امریکہ کی اہم ریاست فلوریڈا سے جہاں لاطینیوں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے، اس تحریر کے لکھے جانے تک مکمل انتخابی نتائج منظرِ عام پر نہیں آئے۔ یہ وہی ریاست ہے جہاں سے صدر بش چند ووٹوں کی بنیاد پر ایک عدالتی تنازعہ کے بعد انتخاب جیت پائے تھے۔ لاطینی شہری اب امریکہ کی آبادی کا تقریباً دس فی صد ہیں۔

جہاں تک امریکی انتخابات میں مسلمانوں کے اثر کا تعلق ہے تو ہمیں یہ حقیقت ذہن میں رکھنا چاہیئے کچھ اندازوں کے مطابق مسلمان امریکہ کی کل آبادی کا ایک فی صد حصہ ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نیویورک شہر، لوس انجیلیس، مینیاپولس سینٹ پول، شکاگو، اور ڈیٹرائٹ میں آباد ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ تعداد اتنی نہیں ہے کہ وہ امریکہ کے کسی بھی انتخاب پر کوئی اثر ڈال سکے، ہاں یہ ممکن ہے کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں آباد ہیں سخت سیاسی مقابلوں میں کسی جماعت کو مدد پہنچا سکیں۔

جہاں تک پاکستانیوں کا تعلق ہے، وہ امریکہ کی آبادی کے اعشاریہ ایک فی صد سے بھی کم ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں کی طرح ان ہی علاقوں میں زیادہ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستانی امریکہ میں فی الحال کوئی اثر نہیں رکھتے، اور نہ ہی مستقبل میں ان کے یہاں کی سیاست پر اثر اندازی کا کوئی امکان دکھائی دیتا ہے۔ کسی بھی نسلی گروہ کی طرح وہ بعض علاقوں میں چند ایک سیاست دانوں کو تو شاید کامیاب کروادیں لیکن وہ مجموعی طور پر امریکہ کی سیاست پر اثر نہیں ڈال سکتے۔ بعض سخت مقابلوں میں سیاست دان ان کے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرسکتے ہیں۔

امریکہ کے حالیہ انتخابات میں صدر اوباما اور ان کے مخالف امیدوار مٹ رومنی Romney کے درمیان کانٹے کا مقابلہ تھا۔ ان انتخابات میں سیاہ فاموں، لاطینی ہسپانویوں، نوجوانوں، اور خواتین نے صدر اوباما کے حق میں ووٹ ڈال کر انہیں کامیاب کروادیا۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان تمام لوگوں نے اپنا ووٹ مقامی ترجیحات اور اپنی نسلی اور قومی ضروریات کی بنیاد پر ڈالا۔ عالمی سیاست کا اثر ان انتخابات پر کم تھا۔ امریکہ کے داخلی معاملات جن میں بے روزگاری، صحت عامہ کی سہولیات، خواتین کے حقوق، اور اقلیتوں کے حقوق، ان انتخابات میں اہم رہے۔ مسلمان اور پاکستانی ان انتخابات سے جو سبق حاصل کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ امریکی صدر دال اور قیمہ پکانے کی بنیاد پر ایسے فیصلہ نہیں کرتا جن کی توقع مسلمان اور پاکستانی عالمی معاملات کے تناظر میں کرتے ہیں۔ دوسرا اہم سبق یہ ہے کہ امریکی جمہوریت میں تشدد ناپید ہے اور یہاں انتخابات انتہائی مہذب طور پر ہوتے ہیں۔ پاکستانی اپنے ہم وطنوں تک یہ سبق پہنچا سکتے ہیں۔